مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

امام ابوالحسن کبیر سندھیؒ

مسلمانوں نے اپنے نبی پاک جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک تعلیم کو
جس طرح بعینہٖ اپنی اصلی شکل میں محفوظ رکھا، دنیا کی تمام دوسری قومیں اس کی مثال پیش
کرنے سے عاجز ہیں۔ ترجمانِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو الفاظ ادا ہو
امت کے مختلف طبقوں نے ان کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ قراء
محدثین نے ان کو اپنے سینوں میں جگہ دی۔ اربابِ تجوید نے مخارج حروف کو، صرفیو
نے صیغے کی ساخت کو، نحویوں نے ترکیبِ کلام کو منضبط کیا، اہلِ معانی نے اعجازِ کلام
سمجھنے کے لیے فن معانی وبیان کی تدوین کی، لغویوں نے مفردات کی تشریح کی۔ متکلمین نے
مابعد الطبیعیاتی حقائق کی توضیح کی۔ اصولیوں نے استنباط کے گر بتائے۔ فقہاء نے ضوابط
حیات کو متعین کیا۔ صوفیہ نے قلبی کیفیات کو محفوظ رکھا اور تنویرِ باطن پر متوجہ ہوگئے۔

حاملانِ دین کے یہ طبقے عہدِ رسالت سے لے کر آج تک اس طرح مسلسل چلے آ
ہیں کہ ان میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی انقطاع واقع نہیں ہوا۔ ان مبارک بزرگوں کے
حالات میں جنھوں نے حفاظتِ دین کی یہ عظیم الشان خدمت انجام دی ہے آپ کو تاری
اسلام میں سینکڑوں ہزاروں کتابیں ملیں گی۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر ان ہی خادمانِ دین میں سے اپنے ملک کی ایک ایسی عظیم شخصیت کا تعارف کرانا ہے جس کو اپنی جلالتِ علمی کی بناء پر ان مختلف طبقات میں خاص حیثیت حاصل ہے۔ یہ شیخ الحرم امام ابوالحسن کبیر سندھی ہیں جو نحو، معانی، منطق، اصول، حدیث، تفسیر، فقہ ان تمام علوم میں ایک بلند پایہ محقق سمجھے جاتے ہیں۔

سندھ کی سرزمین پر سنہ ۹۲ھ میں مسلمانوں نے اپنا قدم جمایا اور جب تک اس صوبہ کا تعلق مسلمانوں کی مرکزی حکومت سے رہا یکے بعد دیگرے متعدد اہلِ علم یہاں کی خاک سے اٹھے اور علمی دنیا میں خاص شہرت کے مالک ہوئے، جن میں

(۱) قاضی منصورہ ابوالعباس احمد بن محمد تمیمی منصوری فقیہ داؤدی

(۲) حافظِ حدیث خلف بن سالم سندھی المتوفی ۲۳۱ھ

(۳) فقیہ ابونصر فتح بن عبداللہ

(۴) محدث ابوجعفر محمد بن ابراہیم دیبلی المتوفی ۳۲۲ھ

(۵) امام مغازی و سیر ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی المتوفی ۱۷۰ھ

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

تاہم اس دور میں سندھ کو کبھی بھی یہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی کہ جس طرح دیگر بلادِ اسلامیہ کی طرف تشنگانِ علمِ نبوی سماعِ حدیث کے لیے سفر کیا کرتے تھے سندھ کی طرف بھی کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے جس طرح اہم شہروں کی تاریخ پر کہ جن کو اس عہد میں کتاب و سنت کی مرکزی درس گاہ ہونے کی حیثیت حاصل تھی اور جہاں دُور دراز سے طلباء تحصیل حدیث کی غرض سے آیا کرتے تھے اور رواۃ و مُسندین اور دیگر مشاہیر اہلِ علم کی نمایاں تعداد وہاں موجود ہوتی تھی مستقل کتابیں لکھی ہیں، سندھ یا ہند کی تاریخ پر کوئی کتاب نہیں لکھی اور پھر جب سندھ کا تعلق دارالخلافے سے کٹ گیا تو یہاں ہر شعبے میں علمی انحطاط شروع ہوگیا اور علمی ترقی اس مقام سے آگے نہ بڑھ سکی کہ جتنی محکمہ قضا کو باقی رکھنے کے لیے اس وقت ضروری تھی اس لیے سندھ کو اس زمانے میں وہ درجہ نصیب

نہ ہو سکا جو دیگر ممالک مثلاً عجم فارس و خراسان و ماوراء النہر وغیرہ کو نصیب ہوا۔ حتیٰ کہ حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی نے جب اپنا مشہور رسالہ "الامصار ذوات الآثار"[1] قلم بند کیا جو ان شہروں کے حالات میں ہے کہ جو ایک زمانے تک علم حدیث کی نشر و اشاعت کا مرکز رہ چکے ہیں، تو برصغیر ہند و سندھ کے متعلق ان کو یہ رائے ظاہر کرنا پڑی۔

فالاقالیم التی لا حدیث بھا یروی ولا عرفت بذلک: الصین اغلق الباب والھند والسند۔

اور وہ ممالک کہ جہاں حدیث کی روایت نہیں کی گئی اور نہ اس علم میں ان کی شہرت ہے چین ہے کہ جس نے دروازہ ہی بند کر رکھا ہے اور ہند اور سندھ ہیں۔

حافظ ذہبی نے ۷۴۸ھ میں وفات پائی ہے اس بنا پر یوں سمجھنا چاہیے کہ آٹھویں صدی کے وسط تک علم حدیث کے سلسلہ میں ہندوستان کی کچھ شہرت نہ تھی۔ باقی یہ ایک الگ بات ہے کہ اس دور میں بھی ایک آدھ محدث اس برصغیر ہند و پاک کے طویل و عریض علاقے میں کہیں نہ کہیں موجود ہو چنانچہ امام حسن بن محمد صغانی لاہوری المتوفی ۶۵۰ھ اور شیخ الاسلام عماد الدین مسعود بن شیبہ سندھی، مصنف "کتاب التعلیم" و "طبقات الحنفیۃ" تو اس پایہ کے محدث گزرے ہیں کہ ان کی تالیفات سے خود عربی دنیا نے فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ حافظ عبدالقادر القرشی ۷۷۵ھ نے الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ میں امام صغانی کے تذکرہ میں جو یہ لکھا ہے کہ "سمع بمکۃ وعدن والھند (انھوں نے مکہ معظمہ، عدن اور ہندوستان میں حدیث کی سماعت کی ہے)" اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ خود ہندوستان میں بھی ساتویں

---

[1] یہ حافظ ذہبی کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں انھوں نے ان شہروں کا حال لکھا ہے جو ایک زمانے میں حدیث و روایت کا مرکز رہ چکے ہیں۔ یہ رسالہ اب نہیں ملتا۔ محدث سخاوی نے "الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ" (صفحہ ۱۳۶، طبع دمشق ۱۳۴۹ھ) میں اس کو بہ تمام و کمال نقل کر دیا ہے اور جابجا ان شہروں کے متعلق اپنی معلومات کا بھی اضافہ کیا ہے جو ذہبی کی عبارت کے بعد قلت کہہ کر شروع ہوتا ہے۔

صدی میں درس حدیث کا سلسلہ موجود تھا تاہم چونکہ اس ملک میں علم حدیث کی عام اشاعت نہ تھی اس لیے حافظ ذہبی نے اس کا شمار ان ممالک میں نہیں کیا جو حدیث وروایت کا مرکز سمجھے جاتے تھے۔ محدث سخاوی نے بھی الاعلان بالتوبیخ میں حافظ ذہبی کے مذکورہ بالا بیان کو نقل کرکے اس پر کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ تک ہندوستان کی اس فن میں وہی حالت تھی جو ذہبی نے بیان کی ہے۔ سخاوی کی وفات سنہ ۹۰۲ھ میں ہوئی ہے اس لحاظ سے ہم کو یوں سمجھنا چاہیے کہ نویں صدی کے اخیر تک یہاں علم حدیث کا رواج نہ تھا۔

اسناد وروایت میں سندوہند کے ترقی نہ کرنے کے کچھ قدرتی اسباب بھی ہیں سندھ ایک مدت سے دارالخلافے سے کٹا ہوا تھا، پھر باطنیوں کی تحریک یہاں زوروں پر تھی، جس نے آگے چل کر ملک پر مکمل اقتدار جمالیا اور طویل عرصے تک باطنیہ نے یہاں حکومت کی۔ ادھر ہندوستان میں مسلمانوں کو جب اطمینان سے سانس لینے کا موقع ملا اور فارغ البالی کے ساتھ حکمرانی کرنے کا وقت آیا جو علوم وفنون کی نشو ونما کے لیے بہترین وقت ہوتا ہے تو عالم اسلام پر زوال آچکا تھا۔ تاتاری وحشیوں نے خوارزم سے لے کر بغداد تک تمام بلاد اسلامیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور مسلمانوں کا وہ قتل عام کیا تھا کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس خونین انقلاب میں سب سے زیادہ نقصان حنفیوں کو اٹھانا پڑا، ان کے تمام علمی مراکز تباہ ہوگئے، کتب خانے برباد ہوگئے اور علماء تہ تیغ کردیئے گئے۔ اس لیے دینی علوم کی وہ سیادت جو اس سے پہلے عراق وفارس اور خراسان و ماوراء النہر میں علماء احناف کو حاصل تھی تمام تر علماء دمشق و مصر[1] کو منتقل ہوگئی۔

حنفیوں نے زوال بغداد پر علمی حیثیت سے اتنا بڑا نقصان اٹھایا تھا کہ اس کی تلافی صدیوں کے بغیر ناممکن تھی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ تین سو سال تک علوم اسلامیہ میں صرف مصر

---

[1] اہل دمشق واہل مصر

وشام سے کیا بلحاظ کثرت اور کیا بلحاظ جلالت مرتبت جس قدر اور جس شان کے علماء پیدا ہوئے سارے عالم اسلام سے نہ ہو سکے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں۔ دسویں صدی ہجری سے آہستہ آہستہ یہ سیادت ہند وسندھ کی طرف منتقل ہونا شروع ہوگئی اور ان قرونِ متأخرہ میں جیسے اکابر علماء یہاں کی سرزمین سے اٹھے سارا عالم اسلام ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

علم حدیث ہی کو لیجیے اس سلسلے میں ہند وسندھ کے بارے میں ابھی حافظ ذہبی کی تصریح آپ کے گوش گزار کی جا چکی ہے، اب ذہبیٔ وقت، محدثِ ناقد علامہ محمد زاہد الکوثری علیہ الرحمۃ کا وہ اعترافِ عظمت بھی ملاحظہ ہو جو انھوں نے اس عظیم اقلیم کی خدمتِ حدیث وسنت پر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

وكان حظ اقليم الهند من هذا الميراث منذ منتصف القرن العاشر هو النشاط في علوم الحديث فاقبل علماء الهند عليها اقبالا كليا بعد ان كانوا منصرفين الى الفقه المجرد والعلوم النظرية ولو استعرضنا ما لعلماء الهند من الهمة العظيمة في علوم الحديث من ذالك الحين مدة ركود سائر الاقاليم لوقع ذلك موقع الاعجاب الكلي والشكر العميق وكم لعلمائهم من شروح ممتعة وتعليقات نافعة على الاصول

اور اقلیم ہند کے حصہ میں اس میراثِ نبوی میں سے دسویں صدی ہجری کے وسط میں علوم حدیث کی سرگرمی آئی ہے چنانچہ (اس عہد سے) ہندوستان کے علماء خالص فقہ اور علوم نظریہ میں مشغول رہنے کے بعد علوم حدیث پر بالکلیہ متوجہ ہوئے اور اگر ہم علوم حدیث کے متعلق علماء ہند کی اس عظیم توجہ کا اس وقت سے جائزہ لیں کہ جب سے تمام ممالک اسلامیہ میں اس علم کی ترقی کا سلسلہ رک گیا تو یہ پوری تحسین اور گہرے تشکر کا موجب بنے گا۔ چنانچہ اندازہ کیجیے کہ وہاں کے علماء نے صحاح ستہ وغیرہ پر کتنی مفید شرحیں اور کتنے مفید حواشی لکھے ہیں اور احادیثِ احکام پر ان کی کتنی وسیع تالیفات موجود ہیں اور تنقید رجال علل حدیث اور شرح احادیث میں ان کے کس قدر

الستة وغيرها وكم لهم من مؤلفات واسعة في احاديث الاحكام وكم لهم من ايادٍ بيضاء في نقد الرجال وعلل الاحاديث وشرح الآثار وتآليف مؤلفات في شتى الموضوعات والله سبحانه هو المسئول ان يديم نشأتهم في خدمة مذاهب اهل الحق ويوفقهم لامثال امثال ما وقفوا له الى الآن وان يبعث هذا النشاط في سائر الاقاليم من جديد۔

شاندار کارنامے ہیں۔ نیز حدیث کے متعلق مختلف موضوعوں پر انھوں نے کس قدر تالیفات چھوڑی ہیں۔ دعا ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ مذاہب حقہ کی خدمت کے سلسلے میں ان کی سرگرمی کو مدام جاری رکھے اور اب تک جو کچھ ان کو کرنے کی توفیق ملی ہے اس سے کئی گنی کرنے کی مزید توفیق ارزانی فرمائے اور اس سرگرمی کو دوسرے ممالک میں بھی نئے سرے سے پیدا فرمائے۔ (آمین)

(مقالاتِ کوثری۔ صفحہ ۷۳۔ طبع قاہرہ ۱۳۷۳ھ۔)

اور پھر احادیث احکام کی مشہور ترین کتابوں کا ذکر کرکے فرماتے ہیں:۔

ثم يأتي دور اخواننا الهنود من اهل السنة۔ فمآثرهم في السنة في القرون الاخيرة فوق كل تقدير وشروحهم في الاصول الستة تزخر بالتوسع في احاديث الاحكام۔

پھر ہمارے اہل سنت ہندی بھائیوں کا دور آیا جن کے شاندار کارنامے پچھلی صدیوں میں علم سنت کے متعلق ہر اندازے سے بڑھ کر ہیں اور صحاح ستہ پر ان کی شرحیں احادیث احکام کی وسیع معلومات سے بھرپور ہیں۔

(صفحہ ۷۴)

اور مصر کے مشہور صحافی سید رشید رضا نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ

ولولا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضى علينا بالزوال من امصار الشرق فقد ضعفت في مصر والشام والعراق والحجاز

اور اگر ہمارے بھائی ہندوستانی علماء کی توجہ اس زمانے میں علوم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو ان علوم کے زوال کا بلادِ مشرق میں فیصلہ ہوچکا تھا۔ کیوں کہ یہ علوم مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں

منذ قرن العاشر للهجرة حتى بلغت منتهى الضعف فى اوائل هذا القرن الرابع عشر۔ (مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ۔ صفحہ ۶۔ طبع مصر)

صدی ہجری سے ضعیف ہوچکے ہیں حتی کہ اس چودھویں صدی کے اوائل میں تو انتہائی ضعف کو پہنچ چکے تھے۔

علماء سندھ میں "ابوالحسن" نامی چار بزرگ زیادہ نامی و گرامی گزرے ہیں:۔

۱:۔ **میاں ابوالحسن** صاحب منظومہ، جن کے بارے میں علی شیر قانع کے تحفۃ الکرام میں یہ الفاظ ہیں:۔

"میاں ابوالحسن کامل وقت صاحب علم و عمل بودہ، منظومہ سندھی در عقاید اسلام و فرائض ایمان کہ ورد خاص و عام است از و یادگار، بزرگیش را عالمے قائل۔" (۲۲۷۔ ج ۳)

ان کے باپ کا نام عبدالعزیز اور ان کا سنہ وفات ۱۱۳۳ھ ہے۔

۲:۔ **میاں غلام حسن** المعروف بہ **ابوالحسن** المتوفی ۱۱۸۷ھ جو اپنے اُستاذ الاستاذ ابوالحسن کبیر سے امتیاز کی بناء پر "ابوالحسن صغیر" کہلاتے ہیں۔ قانع نے تحفۃ الکرام میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:۔

"میاں غلام حسن المعروف بہ بمخدوم ابوالحسن بحرین شریفین زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً رفتہ نمود وافی کرد۔ بعد فوت مخدوم محمد حیات سندی کہ مدرسہ آرائے مدینہ منورہ بود در آں سرزمین اعلم علماء و افضل فضلاء زیستہ جانشین سرآمد محدثان باکمال و سرکردہ مدرسان صاحب قال و حال می باشند۔" (صفحہ ۲۳۶۔ جلد ۳)

۳:۔ **حاجی ابوالحسن** سندھی نقشبندی قرشی داہری مصنف کتاب ینابیع الحیاۃ الابدیۃ لطلاب الطریق النقشبندیہ۔ ان کا سلسلہ طریقت صرف دو واسطوں سے حضرت خواجہ معصوم بن مجدد الف ثانی علیہما الرحمۃ تک پہنچتا ہے۔ داہری نے "ینابیع" کی تصنیف سے جیسا کہ خاتمۂ کتاب میں مصرح ہے ۱۱۵۶ھ میں فراغت پائی ہے۔ ان کی تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول ۱۱۸۱ھ ہے۔

ہم ہے۔ یہی ہمارے ابوالحسن کبیر جو علو مرتبت وجلالت قدر کے اعتبار سے ان سب پر فائق تھے اور ہمارے مقالہ کا مقصد موصوف کا اجمالی تعارف ہے ۔

نام ونسب

ان کا نام محمد، کنیت ابوالحسن اور لقب نورالدین ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے :-

"محمد بن عبدالہادی السندی التتوی ثم المدنی الحنفی"

ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے تھے وہیں نشو ونما پائی اور تعلیم حاصل کی تا آنکہ اپنے وطن ہی میں ایک محقق عالم کی حیثیت سے شمار ہونے لگے اور طلبہ کا مرجع بن گئے۔ ان کے شاگرد رشید شیخ محمد حیات کا بیان ہے ۔

"کان مولدہ فی السند فی بلدۃ یقال لہا تتہ لنشأ بہا عالماً محققاً مرجعاً للطلبۃ"[1]

علامہ مرادی کی سلک الدرر کا جو نسخہ مصر میں طبع ہو کر شائع ہوا ہے اس میں ابوالحسن کے ترجمہ میں اس مقام پر عبارت میں کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے ۔ مطبوعہ نسخہ کی عبارت حسب ذیل ہے ۔

"ولد بتتہ قریۃ من بلاد السند ونشأ بہا ثم ارتحل الی تستر واخذ بہا عن جملۃ من الشیوخ"

یعنی یہ ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے جو دیار سندھ کا ایک گاؤں ہے ۔ وہیں نشو ونما پائی۔ پھر تستر کا سفر کیا اور وہاں کے شیوخ کی ایک جماعت سے تحصیل علم کی ۔

ہمارے خیال میں یہ عبارت کئی طرح سے محل نظر ہے۔ تستر کی طرف سفر کا کوئی بھی تذکرہ نگار ذکر نہیں کرتا ۔ ویسے بھی تستر کی طرف سفر کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی اس زمانہ میں اس کی کوئی علمی شہرت نہ تھی کہ وہاں سفر کر کے جایا جاتا ۔ ہمارے خیال میں مصنف (کمپوزیٹر) یا کاتب کی عنایت سے یہاں تتہ کا تستر ہو گیا ہے اور ولد بتتہ میں

---

[1] دریج الدرر فی نقض وجوہ وضع الایدی تحت السرر از ابوتراب رشداللہ ۔

اس گاؤں کی نشان دہی ہے جو ٹھٹہ کے حوالی میں شیخ کا مولد تھا اور شاید تستر کی طرح اس کو بھی تتہ سے تجدیس خطی کا شرف حاصل ہوگا ورنہ ظاہر ہے کہ تتہ کی حیثیت اس عہد کی تاریخ میں قریہ کی نہیں بلکہ بلدۂ عظیمہ کی تھی۔ صاحب نزہۃ الخواطر کا ماخذ علامہ ابوالحسن کے تذکرہ میں یہی سلک الدرر ہے وہ تتہ کو قریہ بتانے پر تو چونکے ہیں اور اس لیے انھوں نے عبارت میں تصرف کرکے ولد بتتۃ قریۃ من بلاد السند کی بجائے ولد ببلدۃ تتہ من اقلیم السند لکھا ہے لیکن اس طرف ان کا ذہن منتقل نہ ہوا کہ سفر تستر کی کیا ضرورت تھی اس لیے اس کو برقرار رکھا۔

اساتذہ وشیوخ

علامہ موصوف نے سوائے علم حدیث کے جملہ علوم و فنون کی تحصیل اپنے وطن ہی میں کی تھی۔ سلسلہ روایت کی بنا پر ان شیوخ کے نام تو محفوظ ہیں جن سے حرمین شریفین میں سماع حدیث کیا تھا لیکن مقامی علماء جن کی بدولت شیخ کی علمی استعداد علوم متداولہ میں کمال کو پہنچی اور وہ علامہ کہلائے، ان میں سے کسی ایک کا بھی نام معلوم نہیں۔ مرادی کی مذکورہ بالا عبارت میں اگر تستر کے بجائے تتہ پڑھا جائے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے واخذ بھا عن جماعۃ من الشیوخ یعنی انھوں نے وہاں کے اساتذہ کی ایک جماعت سے علم کی تحصیل کی تھی۔ ملا عابد سندھی بھی یہی لکھتے ہیں کہ

اخذ عن جماعۃ من العلماء الاعلام فی بلدہ والحرمین وغیرھما	انھوں نے علماء اعلام کی ایک جماعت، سے اپنے وطن میں اور حرمین وغیرہ میں علم حاصل کیا۔

ان علماء اعلام میں جو مشاہیر حرم تھے وہ یہ ہیں :-

۱ ــــ برہان الدین ابراہیم بن حسن الکردی الکورانی المتوفی ۱۱۰۱ھ ۔شاہ ولی اللہ

---

(۱) ملاحظہ ہو درج الدرر۔ واضح رہے کہ درج الدرر میں علامہ ابوالحسن کا جتنا تذکرہ ہے وہ بہ تمام وکمال صحیح مسلم کا جو حاشیہ علامہ موصوف کا ملتان میں شائع ہوا ہے اس کے آخر میں صفحہ ۹۰ پر مولوی عبدالوہاب ملتانی نے نقل کر دیا ہے۔

نے انسان العین فی مشائخ الحرمین میں ان کا تذکرہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"شیخ ابراہیم کردی قدس سرہ عالم بود و عارف در فنون علم از فقہ شافعی و حدیث و عربیت و اصلین ید طولی داشت و در ہر یکے تصانیف دارد ..... زبان فارسی و کردی و ترکی و عربی ہمہ می دانست و بتوقد ذہن و تبحر علم و زہد و تواضع و صبر و حلم متصف بود .....

عبداللہ عیاشی گفت کہ کان مجلسہ روضۃ من ریاض الجنۃ چوں تقریر مسائل حکمت کردے البتہ حقائق صوفیہ در ضمن آں ذکر کردے و ترجیح کلام صوفیہ بر تحقیق آنہا بیان فرمودے و گفتے ہولاء الفلاسفۃ قاربوا عثورا علی الحق ولم یہتدوا الیہ[1] ۔

تاریخ وفات وے یکے از خطباء زمانہ ازیں لفظ برآورد :۔

"انا علی فراقك یا ابراهیم لمحزونون"

(صفحہ ۷۔ ۸ مطبوعہ مطبع احمدی ۔ دہلی)

۲ــــــ محمد بن عبد الرسول برزنجی۔ یہ ملا کورانی مذکور صدر کے شاگرد خاص تھے چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ان کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ

"سید محمد برزنجی کہ یکے از اجلہ تلامذۂ شیخ بود" (صفحہ ۷)

۳ــــــ عبداللہ بن سالم بصری، شاہ ولی اللہ صاحب نے انسان العین میں ان کا بھی ترجمہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"شیخ عبداللہ بن سالم البصری ثم المکی احیاء بسیارے از کتب حدیث کرد۔ از انجملہ مسند امام احمد ..... و از کتب ستہ نیز اصول مصححہ ساخت ..... و بر بخاری شرحے دارد مسمّٰی بضیاء الساری

---

[1] یہ فلاسفہ حق سے بہرہ ور ہونے کے قریب تھے مگر راہ نہ پا سکے۔

کہ بہ سبب ضعف پیری اتمام آں نتوانست کرد، و ہمہ عمر بروایت کتب حدیث سرداً و بحثاً گزرانید، بالجملہ بتحقیقت حافظ دریں زمانہ متأخر وے بود ...... وسبب بقائے ایں سلسلہ وے شد از ابتدا صبا رغبت علم علماء و صلاح و ورع پیشۂ مرغیبہ وے بود ..... و ہیچ وقت خالی نبودے از درس یا تلاوت یا نماز یا سخن ضروری ..... عمرے طویل یافت و آن ہمہ در مرضیات الٰہی گزاشت و تا آخر عمر بوفور عقل و حفظ و صحت حواس متصف الاسامتہ کفی الجملہ فتور یافتہ بود ...... اہل مکہ اکثر ایشان بروے سماع کردند رابع رجب ۱۱۳۴ھ اربع و ثلاثین و مائۃ بعد الالف برفت از دنیا۔"

(صفحہ ۱۲ و ۱۳)

یوں تو علامہ سندھی نے اس طبقہ کے بعض اور اکابر سے بھی علم حدیث کی تحصیل کی ہے لیکن مشہور یہی تین ہیں۔ شیخ عبدالحی کتانی فاسی فہرس الفہارس والاثبات ومعجم المعاجم والمشیخات میں شیخ ابوالحسن کبیر کے ترجمہ میں لکھتے ہیں :۔

"یروی عن الشمس محمد بن عبدالرسول البرزنجی و البرهان الکورانی وعبدالله البصری وتلك الطبقة۔"

(صفحہ ۱۰۳۔جلد ۱)

ان تمام شیوخ و اساتذہ میں سب سے زیادہ جس کا اثر علامہ سندھی کے ذہن و فکر پر ہوا وہ شیخ ابراہیم کورانی ہیں۔ یاد رہے کورانی کی اس درس گاہ سے سندھ و ہند کے دو مشہور امام متاثر ہو کر نکلتے ہیں :۔ ایک امام ابوالحسن کبیر سندھی اور دوسرے امام ولی اللہ دہلوی۔ ابوالحسن نے باپ سے تحصیل حدیث کی ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کے بیٹے ابوطاہر ابن ابراہیم کردی سے۔ یہی درس گاہ ہے جہاں ان دونوں اماموں کی ماتریدیت میں اشعریت کا اور حنفیت میں شافعیت کا اور تصوف میں فلسفے کا اور تنزیہ میں تشبیہ کا اور توحید شہودی میں توحید وجودی کا پیوند لگایا گیا ہے۔ ان حضرات کی تصانیف میں ہمارے اہل علم کو جو

بعض مقامات پر فقہاء حنفیہ اور متکلمین سے شدید اختلاف نظر آتا ہے وہ اسی کا اثر ہے اس تاثر کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں بزرگ اگرچہ سندھ و ہندوستان میں علوم معقول و منقول کی پوری تحصیل کر کے گئے تھے لیکن ان کی معلومات میں دو بڑے خلا تھے۔ ایک یہ کہ مشکوٰۃ سے آگے علم حدیث میں رسائی نہ تھی۔ دوسرے قدماء حنفیہ کی تصانیف پر سرے سے نظر نہ تھی اس لیے ان دونوں باپ بیٹوں سے، جو اپنے عہد کے وسیع النظر عالم تھے امام سندھی و ہندی کا متاثر ہونا ضروری تھا۔

سفرِ حرمین، مجاورتِ حرم نبوی اور درسِ حدیث

علامہ سندھی نے جب تحصیلِ حدیث کی غرض سے حرمین شریفین کا سفر کیا تو پھر وہیں کے ہو رہے اور مراجعت وطن کا خیال ہی دل سے نکال ڈالا۔ شروع شروع میں تو دس سال تک عزلت گزینی کی وجہ سے ان کی شہرت نہ ہو سکی لیکن بعد کو جب حرم نبوی میں مجلس درس آراستہ کی تو آسمانِ علم پر خورشیدِ درخشاں بن کر چمکے۔ ملا حیات کے الفاظ ہیں

"ثم سافر الی الحرمين على نية القراءة فمكث فيها نحواً
من عشر سنين لم يشتهر لكثرة عزلته ثم جلس للتدريس
في الحرم النبوي" (درج الدرر)

مدینہ طیبہ میں علامہ موصوف جن کتابوں کا درس دیا کرتے تھے۔ اربابِ تذکرہ نے ان میں حسب ذیل کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے :-

تفسیر میں :- قاضی بیضاوی

حدیث میں :- صحاح ستہ، مؤطا امام مالکؒ، مسند امام احمد بن حنبلؒ

فقہ میں :- ہدایہ

حسن اخلاق ورع و تقویٰ

علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے عمل کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ مزاج میں انکساری عمل میں نکوکاری اور کتاب و سنت کی اتباع کا جذبہ موصوف کے خصوصی اوصاف تھے چنانچہ تذکرہ نگاروں نے فضل و ذکاء کے ساتھ ساتھ ان کی نکوکاری، صلاح و تقویٰ اور

زہد و ورع کو بھی خاص طور پر بیان کیا ہے۔ مرادی لکھتے ہیں :-

اشتہر بالفضل والذکاء والصلاح ... وکان عالمًا عاملًا ورعًا زاھدًا۔

ملّا محمد حیات کا بیان ہے :-

وکان زاھدا متورعًا کثیرًا الاتباع لکتاب اللہ تعالیٰ و سنۃ رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم ومتواضعًا۔

تلامذہ

علامہ سندھی کے تلامذہ کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ ملا عابد سندھی لکھتے ہیں :-

واخذ عنہ جماعۃ لایحصون

"اُن سے اتنی بڑی جماعت نے علم اخذ کیا کہ جو شمار نہیں کی جا سکتی" لیکن ان تمام تلامذہ میں ان کی جانشینی کا فخر جس خوش قسمت کے حصے میں آیا وہ محدث محمد حیات سندھی مدنی ہیں۔ آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان اور مآثر الکرام میں اور نواب صدیق حسن خان نے اتحاف النبلاء المتقین میں ان کا مبسوط تذکرہ کیا ہے۔ قانع کی زبانی یہ آپ پہلے سن چکے ہیں کہ ملا حیات کے بعد ان کی مسندِ درس کو جس بزرگ نے سنبھالا وہ ملا موصوف کے شاگردِ رشید شیخ ابوالحسن صغیر محدث سندھی ثم المدنی ہیں۔ اس طرح حرم نبوی میں درسِ حدیث کا جو سلسلہ ہمارے علامہ ابُوالحسن کبیر نے جاری کیا تھا وہ ان کے شاگرد تک برابر قائم رہا اور ایک عالم اس سے فیض یاب ہوا۔

عُلماء کا ان کی خدمت میں خراج تحسین

علامہ مرادی کے سلک الدرر (جلد ۴ صفحہ ۶۶) میں ان کے بارے میں یہ الفاظ ہیں :

"محمد السندی، ابن عبدالھادی السندی الاصل والمولد الحنفی نزیل المدینۃ المنورۃ الشیخ الامام العامل العلامۃ المحقق المدقق النحریر الفھامۃ ابوالحسن نورالدین... ... درس بالحرم الشریف النبوی ...... وکان شیخًا جلیلًا ماھرًا

محققا بالحدیث والتفسیر والفقہ والاصول والمعانی و العربیۃ وغیرھا"

نزہۃ الخواطر میں ان کا تذکرہ تمام تر سلک الدرر ہی سے منقول ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ۶۔ صفحہ ۵ و ۶)

جبرتی لکھتے ہیں :۔

"العلامۃ ذو الفنون ابوالحسن بن عبد الھادی الاثری شارح المسند والکتب الستۃ وشارح الھدایۃ" (عجائب الآثار جلد ۱۔ صفحہ ۱۷۶۔ ۱۷۷ بر حاشیہ تاریخ کامل لابن اثیر، طبع مصر)

اور شیخ محسن یمنی الیانع الجنی میں رقمطراز ہیں :۔

"وابو الحسن الکبیر ..... کان عالما جلیلا فقیھا اصولیا محدثا من اصحاب الوجوہ فی المذھب" (صفحہ ۳۳۔ طبع دیوبند بر حاشیہ کشف الاستار عن رجال المعانی الآثار) [1]

علامہ محمد عابد سندھی فرماتے ہیں :۔

"کان عالما ضابطا متقنا حوی جمیع العلوم وخاض فی مضایقھا والمفھوم واختص بعلم الحدیث وبلغ فیہ الغایۃ" (درج الدرر)

شیخ محمد حیات کے الفاظ ہیں :۔

"کان شیخا جلیلا ماھرا محققا فی النحو والمعانی والمنطق والاصول والتفسیر والحدیث ولہ تحقیق فی الفقہ" (درج الدرر)

صاحب فہرس الفہارس شیخ عبد الحی کتانی نے ان کا تذکرہ ان لفظوں میں شروع

---

[1] سلک الدرر، عجائب الآثار اور الیانع الجنی سے علامہ ممدوح کا تذکرہ راقم حروف نے اپنی عربی تالیف ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ میں نقل کر دیا ہے۔

کیا ہے :-

"ھو محدث المدینۃ المنورۃ واحد من خدم السنۃ من المتأخرین خدمۃ یستھال بھا" (صفحہ ۱۰۲ - جلد ۱)

منزلتِ علمی

ان علماءِ اسلام کی تصریحاتِ بالا سے معلوم ہوا کہ علامہ سندھی کو تفسیر، حدیث، فقہ، اُصول، نحو، عربیت، معانی، منطق تمام علوم میں تبحر کا درجہ حاصل تھا اور وہ ان سب فنون میں محققانہ امتیاز رکھتے تھے، خاص طور پر فقہ و حدیث میں ان کا درجہ بہت اونچا تھا۔ علامہ سندھی کی متعدد تصانیف اب چھپ کر منظرِ عام پر آگئی ہیں جن سے ان کی جلالتِ علمی کا آج بھی اہلِ علم کو اندازہ ہو سکتا ہے۔

صحاحِ ستہ پر حافظ سیوطی نے بھی تعلیقات لکھی ہیں اور علامہ سندھی نے بھی سُنن نسائی اور سُنن ابن ماجہ پر ان دونوں حضرات کے حواشی طبع ہو چکے ہیں[1] دونوں کا موازنہ کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ سیوطی کے یہاں غرر نقول موجود ہیں اور علامہ سندھی نے خود ان کی شروح سے کافی فائدہ اٹھایا ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جہاں نقل سے نہیں بلکہ عقل سے کام پڑتا ہے اور فہمِ مراد اور توضیحِ مطلب کی باری آتی ہے وہاں کس کا پلّہ بھاری ہے؟ یہ مختصر مقالہ بیانِ امثلہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ سیوطی اگر وسعتِ نظر میں بڑھے ہوئے ہیں تو علامہ دقتِ نظر میں فائق ہیں۔ جہاں وہ دوسرے شارحین توجیہ حدیث سے

---

[1] سنن نسائی پر تو ان دونوں حضرات کے حاشیے ہندوستان و مصر میں کتاب کے ساتھ ہی طبع ہوئے ہیں۔ مگر سنن ابن ماجہ پر علامہ سندھی کا حاشیہ تو متن کے ساتھ مصر میں طبع ہو چکا ہے، لیکن حافظ سیوطی کا حاشیہ کتاب کے ساتھ طبع نہیں ہوا بلکہ اس کا اختصار جو شیخ دمنتی نے کیا ہے وہ مصر میں بغیر متن کتاب کے الگ شائع ہوا ہے۔ یہ اختصار کہنے کو اختصار ہے، ورنہ اصل کتاب کی پوری پوری نقل ہے۔ صرف کتبِ حدیث کے حوالوں میں نام ذکر کرنے کے بجائے اُن کے رموز دیدیئے ہیں۔

عاجز ہوتے ہیں وہاں علامہ بہترین توجیہ پیش کردیتے ہیں۔سیوطی کو سات علوم میں اجتہاد کا دعویٰ تھا منجملہ ان کے نحو وعربیت بھی ہیں لیکن نسائی کے دونوں حاشیے اس بات کے شاہد ہیں کہ متعدد مقامات پر علامہ سیوطی نے تحلیل صرفی یا ترکیب نحوی یا وجوہ معانی کے لحاظ سے کسی ایک خاص توجیہ کی صحت سے انکار کیا۔اور ہمارے علامہ نے اسی خاص توجیہ کو صرف یا نحو یا علم معانی کی روشنی میں مدلل کردیا ہے۔

سُنن نسائی کے تراجم ابواب پر جس طرح علامہ سندھی نے کلام کیا ہے کسی نے نہیں کیا۔اسی طرح سنن ابن ماجہ کے زوائد پر حافظ بوصیری کی تحقیقات کو نقل کرکے سیوطی کے مقابلے میں انھوں نے اپنی شرح کو آسمان پر پہنچادیا ہے۔

علم حدیث پر علامہ سندھی نے خاص توجہ کی ہے اور اس فن میں انھوں نے بڑی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔برصغیر پاک وہند میں یہی ایک بزرگ ہیں جن کو صحاح ستہ کی تمام کتابوں پر شرح لکھنے کا فخر حاصل ہے۔ان کی جلالتِ قدر کا اعتراف عرب و عجم کے علماء کو ہے۔شیخ اسماعیل بن محمد سعید نے جب اپنے مشہور شاگرد دمنتی کو علم حدیث کی سند دی تو علامہ سندھی کے متعلق یہاں تک لکھ دیا کہ

"کان احد الحفاظ المحققین والجہابذۃ المدققین"۔[1]

علامہ ممدوح کے محقق ومدقق اور جہبذ ہونے میں تو ہمیں کلام نہیں البتہ ان کو حافظِ حدیث کہنا مبالغے سے خالی نہیں۔حافظ کی جو تعریف کتبِ اصولِ حدیث میں بیان کی گئی ہے وہ ان پر صادق نہیں آتی۔کیوں کہ ان پر روایت سے زیادہ درایت کا غلبہ ہے۔ہمارے نزدیک علم حدیث میں ان کا وہی درجہ ہے جو علامہ طیبی شارح مشکوٰۃ کا۔حافظ سیوطی نے علامہ طیبی کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے:-

ولہ الماہر بالحدیث لکنہ	ان کو علم حدیث پر توجہ رہی ہے لیکن یہ اس فن
لم یبلغ فیہ درجۃ الحفاظ ومنتہی	میں حفاظ حدیث کے درجہ پر نہ پہنچ سکے۔ان کا منتہیٰ

---

[1] فہرس الفہارس، جلد ۱ صفحہ ۱۰۳۔

نظرہ الکتب الستۃ ومسند احمد والدارمی لایخرج من غیرھا[1]

صحاح ستہ، مسند احمد اور دارمی ہیں۔ ان کے علاوہ اور کتابوں سے یہ تخریج حدیث نہیں کرتے۔

علامہ طیبی کی طرح علامہ سندھی کا منتہائے نظر بھی صحاح ستہ اور مسند احمد پر جاکر ختم ہوجاتا ہے۔ اس لیے حافظ حدیث کے بجائے ان کو محدّث فقیہ کہنا زیبا ہے۔ کتب مذکورہ کے متون احادیث پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ وہ شرح حدیث کے امام ہیں اور خوب سے خوب توجیہ اور عمدہ سے عمدہ نکتے بیان کرتے ہیں۔

فقہ میں بھی علامہ کے شاگرد ملاحیات نے ان کے بارے میں تصریح کی ہے کہ

"ولہ تحقیق فی الفقہ"

جو ایک حقیقت کا بیان ہے کہ بعض مسائل فقہ میں ان کی تحقیق حنفی مذہب سے الگ ہے، مگر صاحب الیانع الجنی نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہاں تک دعویٰ کردیا ہے کہ

"من اصحاب الوجوہ فی المذھب"

معلوم نہیں صاحب الیانع الجنی "اصحاب الوجوہ" کی اصطلاح سے واقف بھی تھے یا نہیں۔ "اصحاب الوجوہ" کا درجہ "مجتہد فی المذہب" سے بالا اور مجتہد مطلق منتسب کے بعد ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جو طحاوی، کرخی، حارثی اور جرجانی کا تھا۔ علامہ سندھی کو ان ائمہ سے وہی نسبت ہے جو ستارہ کو آفتاب سے۔ یہ تحقیق و وجوہ جنھیں اتنی اہمیت دی جارہی ہے، وہی ہیں جن کی داغ بیل ملاکورانی کی درس گاہ میں پڑی تھی۔ یہاں علماء شوافع کی تو بہترین کتابیں مطالعہ کے لیے موجود تھیں مگر احناف کی ترجمانی کے لیے فتح القدیر سے زیادہ کچھ نہ تھا ظاہر ہے کہ امام شافعی کی کتاب الام اور بغوی کی شرح السنۃ کا مقابلہ جب کہ صحاح ستہ کی تبویب بھی سامنے ہو تنہا فتح القدیر سے نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اثناء درس میں جن تحقیقات نے دل میں گھر کرلیا تھا وہ آخر تک اپنا رنگ دکھاتی رہیں۔ تاہم علامہ سندھی اپنے کو حنفی ہی کہتے اور سمجھتے ہیں۔

---

[1] شرح مواہب لدنیہ از علامہ زرقانی جلد ۵ صفحہ ۷، طبع مصر۔

علامہ سندھی اور شاہ ولی اللہ یہ دونوں بزرگ حنفی مذہب کے مسائل صحاح ستہ اور مسند احمد کی روایات پر پیش کیا کرتے ہیں۔ اگر موافقت ہو تو خیر ہے۔ ورنہ درصورت اختلاف ان روایات کو ترجیح دیتے ہیں جن پر ارباب صحاح نے تبویب کی ہے۔ اس تحقیق میں ایک تو کمی یہ ہے کہ بعض اوقات ایک روایت ان ہی کتابوں میں موجود ہوتی ہے مگر وہ اس بے نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ اپنے مظان پر مذکور نہیں ہوتی جیسے: رؤیتِ ہلال کا یہ مسئلہ کہ جب مطلع صاف ہو تو اتنے جم غفیر کی شہادت درکار ہے کہ جس پر اطمینان کیا جا سکے۔ یہ مسئلہ جس حدیث سے لیا گیا ہے وہ نہ کتاب الصوم میں ملے گی نہ عیدین میں بلکہ کتاب الصلوٰۃ باب سجود السہو میں ملے گی جس میں یہ مذکور ہے کہ "ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور اٹھ کر جانے لگے اس پر ذوالیدین نامی ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا نماز کم ہو گئی یا آپ بھول گئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کا یقین نہ کرتے ہوئے دوسرے صحابہ سے دریافت کیا۔ ظاہر ہے کہ جس واقعہ سے سب کو سابقہ پڑا ہو وہاں تنہا ایک شخص کا بیان کس طرح کافی ہو سکتا تھا، اور جب دیگر صحابہ نے بھی اس امر کی شہادت دی تو آپ نے بقیہ نماز ادا کر کے سجدۂ سہو ادا فرمایا۔"

اس روایت سے فقہائے حنفیہ نے یہ مسئلہ نکالا کہ جس مسئلہ میں ابتلاء عام ہو وہاں خبر آحاد قابل قبول نہیں۔ بلکہ اتنی وقیع شہادت درکار ہے جو قابل اطمینان ہو۔ اسی بناء پر مسئلہ رؤیت ہلال میں فقیہ ابوبکر بلخی نے تصریح کی ہے کہ ہمارے زمانے میں پانچ سو بھی بلخ میں کم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں لاکھوں نظریں آسمان پر جمی ہوں وہاں معدودے چند افراد کی شہادت کیسے قبول کی جا سکتی ہے۔ تاہم بعض فقہاء کی نظر اس روایت پر نہ گئی اور انھوں نے اس موقع پر بھی دو آدمیوں کی شہادت کو کافی سمجھ لیا۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ حدیث کا ذخیرہ ہی کتابوں محدود نہیں۔ بعض وقت یا تو سرے سے ایک مسئلے کی روایت ان میں موجود ہی نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو وہ قابل ترجیح سند سے نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں جس کی نظر میں جو روایت ہوگی وہ اسی کو ترجیح

دے گا۔ علامہ مخدوم محمد ہاشم سندھی اور علامہ ابوالحسن سندھی کی تحقیقات میں تو بنیادی فرق یہی ہے۔ مخدوم صاحب، جب کسی مسئلہ کی تحقیق کرنے بیٹھتے ہیں تو اپنی تحقیقات کا دائرہ مسند احمد اور صحاح ستہ تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جیسا کہ ان کے نامور صاحبزادے مولانا عبداللطیف نے ذیل ذبابات الدراسات (صفحہ ۱۵۔جلد ۱) میں تصریح کی ہے وہ حدیث کی سو ڈیڑھ سو کتابوں کا ایک ساتھ جائزہ لے ڈالتے ہیں اور جب تک پوری طرح اطمینان نہیں کر لیتے اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ نے ان کو حدیث وفقہ کی بیش بہا کتابوں کا ذخیرہ بھی ایسا عنایت کیا تھا کہ شاید و باید[1] یہی وجہ ہے کہ اس دیار میں مخدوم صاحب کے مقابلہ میں اور کسی عالم کا چراغ روشن نہ ہو سکا۔

تاہم اجتہادی مسائل میں طرفین سے مجال سخن تنگ نہیں، غلط فہمی نہ ہو مسائل فرعیہ کی الگ بات ہے جہاں تک شرح حدیث اور توجیہ معانی کا تعلق ہے نہ علامہ ابوالحسن سندھی کی نظیر علماء سندھ میں ہے نہ شاہ ولی اللہ کی مثال علماء ہند میں۔ دقیقہ سنجی اور نکتہ آفرینی ان دونوں بزرگوں پر ختم ہے۔

تصانیف

(۱) تا (۶) حواشی علی الصحاح الستہ۔ یہ حدیث کی مشہور چھ کتابوں پر ان کے الگ الگ چھ حاشیے ہیں۔ البتہ جامع ترمذی پر ان کا حاشیہ مکمل نہ ہو سکا۔ سنن ابن ماجہ کا حاشیہ سب سے زیادہ مبسوط ہے۔ باقی حواشی مختصر ہیں۔ ان حواشی میں مصنف کا مطمع نظر زیادہ تر کتاب کا حل اور مشکل مقامات کی توضیح ہے۔ ضبط لفظ، ایضاح غریب، تفصیل اعراب سے زیادہ اعتناء کیا ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں کام کی بات لکھتے ہیں۔ صحیح بخاری اور سنن ابن ماجہ کے حواشی مصر میں مکرر طبع ہو چکے ہیں۔ سنن نسائی کا حاشیہ ہندوستان اور مصر دونوں جگہ سے شائع ہو چکا ہے۔ صحیح مسلم کا حاشیہ جو نہایت مختصر ہے ملتان سے شائع

---

[1] ان کے قیمتی کتب خانے کی یادگاریں آج بھی آپ کو سندھ و ہند کے کتب خانوں میں بکھری ہوئی ملیں گی۔

ہوا ہے۔ سنن ابی داؤد کا حاشیہ جس کا نام فتح الودود ہے اگرچہ علیحدہ طبع نہیں ہوا لیکن سنن ابی داؤد کی تمام شروح و حواشی میں موقع بموقع منقول ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بھی کتب خانہ پیر جھنڈو میں موجود ہے۔

(۷) حاشیہ علی مسند الامام احمد۔ اس کا نسخہ اول صاحب فہرس الفہارس کے پاس موجود ہے۔ جس کا تعارف انھوں نے ان لفظوں میں کرایا ہے:۔

لا یستغنی عنہا مطالعہ او قارئہ

کہ جس کو مسند کا مطالعہ کرنا یا پڑھنا ہو وہ اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

صاحب سلک الدرر لکھتے ہیں:۔

"ولہ حاشیۃ نفیسۃ علی مسند الامام احمد"

علامہ محمد حیات فرماتے ہیں:۔

"وکتب علیہ حاشیۃ جلیلۃ لم یسبق الیہا"

(۸) حاشیہ علی تفسیر البیضاوی۔ ملا حیات اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔ وکتب علیہا حاشیۃ لطیفۃ۔

(۹) حاشیہ علی فتح القدیر شرح الہدایہ۔ یہ کتاب النکاح تک تو فتح القدیر کا حاشیہ ہے اور پھر اس کے متن ہدایہ کا۔ ملا حیات اس کو "حاشیۃ ذات تحقیق" بتاتے ہیں۔ اس حاشیہ کا نام البدر المنیر ہے۔ اس کا قلمی نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ اور پشاور کے اسلامیہ کالج کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۱۰) حاشیہ کتاب الاذکار، امام نووی

(۱۱) حاشیہ علی الزہراوین، ملا علی قاری

(۱۲) تفسیر لطیف

(۱۳) حاشیہ علی الجلالین

(۱۴) حاشیہ علی شرح جمع الجوامع، لابن قاسم۔ اس کا نام الآیات البینات ہے۔

(۱۵) الفیوضات النبویۃ فی حل المغازی البرکویہ۔ اس کا نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی

میں موجود ہے۔

(۱۶) حاشیہ علی شرح النخبۃ۔ اس کا ذکر صاحب فہرس الفہارس نے کیا ہے۔

ان کی تمام تصنیفات بغایت نافع ومفید تھیں۔ حق تعالیٰ نے قبول عام بھی ان کے متعلق شایانِ شان نصیب فرمایا۔ مرادی لکھتے ہیں :۔

"الف مؤلفات نافعة ..... التی سارت بها الرکبان۔"

اور صاحب الیانع الجنی کی تصریح ہے :۔

لہٗ مؤلفات نافعة جدًا۔

وفات

سنہ وفات میں عجیب اختلاف ہے۔ ملا عابد سندھی نے ۱۱۴۱ھ لکھا ہے (درج الدرر) ملا حیات ۱۱۳۹ھ بتاتے ہیں۔ (درج الدرر) مرادی نے ۱۱۳۸ھ بیان کیا ہے اور جبرتی نے ۱۱۳۶ھ۔ فہرس الفہارس اور الیانع الجنی میں ۱۱۳۹ھ مرقوم ہے۔ جنازے میں بڑا ہجوم تھا، عورتیں تک شریک ہوئیں۔ بازار میں دکانیں بند رہیں۔ عمالِ حکومت ان کا جنازہ کاندھوں پر لیے ہوئے پہلے حرم نبوی میں حاضر ہوئے اور وہیں نمازِ جنازہ ادا کی گئی پھر بقیع میں تدفین عمل میں آئی۔ لوگوں کو ان کی وفات کا سخت صدمہ تھا۔ ایک خلقت ان کے غم میں رو رہی تھی۔

غفر اللہ لہٗ ورحمہٗ رحمۃً واسعۃً۔